اَصنافِ ادب اردو

ایجوکیشنل بُک ہاؤس ○ علی گڑھ

Scanned with CamScanner

مرثیہ

مرثیہ اردو شاعری میں بیش بہا خزانہ ہے۔ اردو غزل میں غزل کی سادگی و سرزدگداز، قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا انداز بیان، رزم و بزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی حق و باطل کی جنگ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔

مرثیہ اس نظم کو کہتے ہیں جو کسی کے مرنے پر لکھی جائے اور جس میں مرنے والے کی خوبیاں بیان کی جائیں اور اپنے غم واندوہ کا اظہار کیا جائے مثلاً مولانا الطاف حسین حالی نے غالب کی وفات پر ان کا مرثیہ لکھا تھا جو بہت مشہور ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال نے داغ کا مرثیہ کہا تھا لیکن اردو میں عام طور پر مرثیہ اس نظم کو کہا جاتا ہے جس میں کربلا کے اندوہ ناک واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت امام حسین اور ان کے ساتھیوں کے شہید ہونے کا ماتم کیا جاتا ہے۔ مرثیے کے لئے کوئی ایک فارم مقرر نہیں ہے۔ عہد سودا اور اس سے قبل مرثیے مربع، مستزاد، ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، ترجیع بند، مثنوی اور غزل وغیرہ کی شکل میں لکھے جاتے ہیں۔

بعض ادبی مورخین کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل دی

وہ مرزا محمد رفیع سوداؔ ہیں۔ بعد میں مرثیہ کی یہی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ شبلیؔ نے بھی موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ میں لکھا ہے سوداؔ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مرثیہ مسدس کی شکل میں لکھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سوداؔ کے ایک معاصر سکندر مرثیہ گو نے پہلی بار مرثیہ کو مسدس کی شکل دی۔ مرثیہ کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ چہرہ ــــ اس میں صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے سے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت منقبت اور مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں۔

۲۔ سراپا ــــ مرثیے کے ہیرو کے قد و قامت، خط و خال اور لباس وغیرہ کا بیان۔

۳۔ رخصت ــــ ہیرو کا امام حسینؑ سے جنگ کی رخصت لینا اور میدانِ جنگ میں جانے کے لئے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

۴۔ آمد ــــ ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا۔ آمد کے سلسلے میں ہیرو کے گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

۵۔ رجز ــــ ہیرو کی زبان سے اس کے نسب کی تعریف، اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فنِ جنگ میں اس کی مہارت کا اظہار۔

۶۔ جنگ ــــ ہیرو کا کسی نامی پہلوان یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری سے لڑنا۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے، تلوار اور دوسرے ہتھیاروں کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

۷۔ شہادت ــــ ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

Scanned with CamScanner

۸۔ بین ـــ ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جن میں تمام اجزائے ترکیبی ملتے ہوں۔ عام طور پر مرثیوں میں چند اجزا پائے جاتے ہیں۔ بعض میں کچھ اجزا کم ہوتے ہیں اور بعض کی ترکیب مختلف۔ ایسے مرثیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں صرف حضرت امام حسینؓ کی شہادت پر اظہارِ غم کیا گیا ہے۔

اردو مرثیے کا آغاز دکن میں پندرہویں صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ابتدائی مرثیے پانچ سات شعروں سے زیادہ کے نہیں ہوتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی کے ہاں اسی قسم کے مرثیے ملتے ہیں۔ شاید اشرف بیابانی کی مثنوی "نوسرہار" دکن کا پہلا طویل مرثیہ ہے۔ اس کے بعد ہمیں سیوک فائز، لطیف نوری، کاظم اور شاہی وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔

شمالی ہند میں میر اور سودا سے قبل مرثیہ کہنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔ ہمیں اردو شاعروں کے تذکرے میں غلام مصطفےٰ خاں یک رنگ، میر امانی، خواجہ برہان الدین عاصمی، اعلیٰ علی، سید محمد تقی، نذر علی خاں گراں، مرزا علی، قلی ندیم، میر عبداللہ مسکین، حزیں اور غمگین وغیرہ کے نام ملتے ہیں جنھوں نے مرثیے کہے ہیں۔

اب تک بیشتر شاعروں نے مرثیہ گوئی کو مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ اسی لئے اکثر ان کے مرثیے فنِ شاعری کے عام اصولوں سے کچھ حد تک آزاد ہوتے تھے۔ سودا نے سید محمد تقی نام ایک شاعر کے ایک مرثیے پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا ؎

آپ کے مرثیے کا ہوں قائل — خون جس سے عوام کا ہے دل
سُن کے جمّا سے جس پہ بدھو تلک — شام سے کوٹیں سینہ صبح تلک
لیکن افسوس صد ہزار افسوس — یہی آتا ہے بار بار افسوس
بدھو جمّا سمجھ جسے رو دیں — معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں

سودا کو بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مرثیہ گو شاعر فنِ شاعری کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ادب اور احترام کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ ان کے مرثیے پر اعتراض کر دے۔

سودا اور میر دونوں کے کلیات میں مرثیوں کی اچھی تعداد ہے۔ ان دونوں نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کی اور اس فن کا انتہا تک پہنچایا لیکن اس صنفِ سخن کی ہیئت اور مواد میں ان دونوں اور خاص طور پر سودا کے تجربات بہت اہم اور تاریخی اعتبار سے انکی حیثیت اس سنگ میل کی ہے جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے۔ ان دونوں کے بعد بھی دہلی میں شاعروں نے مرثیے لکھے لیکن ان میں کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ہے۔

لکھنؤ میں میر خلیق پہلے شاعر ہیں جنھوں نے صرف مرثیہ گوئی میں کمال حاصل کیا۔ یہ میر حسن کے صاحبزادے تھے۔ میر غلام حسین ضاحک ان کے دادا تھے۔ میر خلیق کو شاعری وراثت میں ملی تھی۔ ان کے دادا پردادا سب نہ صرف شاعر تھے بلکہ سب نے کچھ نہ کچھ مرثیے لکھے تھے۔

خلیق نے غزل گوئی سے شاعری کی ابتدا کی تھی لیکن بعد میں تمام توجہ صرف مرثیہ گوئی پر مرکوز کر دی۔ زبان ان کے گھر کی لونڈی تھی اس لئے روزمرہ پر انھیں

Scanned with CamScanner

کمال حاصل تھا۔ ان کے مرثیوں کی زبان صاف پاکیزہ ہے۔ کہیں محاورے کی غلطی نہیں کرتے۔ تشبیہوں اور استعاروں کا بے جا استعمال نہیں کرتے۔ اسی لئے ان کے مرثیوں میں سوز و گداز اور درد و اثر ہے۔ خلیق کے ہمعصروں میں میر مظفر حسین ضمیر بھی تھے۔ یہ بھی مصحفی کے شاگرد تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مرثیے کے بہت سے اجزائے ترکیبی کی ایجاد اور ان کے ترتیب ضمیر ہی کی مرہونِ منت ہے۔ انھوں نے مرثیے میں رزمیے اور سراپے لکھنے شروع کئے اور انھوں نے روایتیں بھی نظم کرنی شروع کیں۔ ضمیر کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ تشبیہات اور استعارات کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ ان سے پہلے مرثیے ترنم سے پڑھے جاتے تھے۔ ضمیر نے تحت اللفظ پڑھنے کی ابتداء کی۔ اس زمانہ میں دو مرثیہ گو اور تھے فصیح اور دلگیر۔ لیکن جو شہرت اور مقبولیت خلیق اور میر ضمیر کے مرثیوں کو ہوئی وہ ان دونوں کے مرثیوں کو نصیب نہ ہو سکی۔ دلگیر کو امام بخش ناسخ سے تلمذ تھا۔ فنی لحاظ سے ان کے مرثیے کچھ بلند نہیں ہیں۔ انھوں نے مرثیوں میں کوئی جدت بھی پیدا نہیں کی۔ اُن کے ہاں بین زیادہ ہیں۔ غالباً یہ مرثیہ گوئی کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ فصیح بھی ناسخ کے شاگرد تھے۔ ان کے مرثیوں میں زبان کی صفائی بندش کی چستی تو ہے لیکن درد و اثر بہت کم ہے۔

خلیق، ضمیر، دلگیر اور فصیح کی سب سے بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اردو کے عظیم ترین مرثیہ گو شعراء یعنی میر انیس اور مرزا دبیر کے لیے میدان ہموار کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ سے لے کر فصیح تک تمام مرثیہ گو شاعر اس سنہری زمانہ کی تعمیر میں مصروف تھے جس میں انیس اور دبیر کو پیدا ہونا تھا۔

Scanned with CamScanner

میر ببر علی انیسؔ کو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ ان کے دادا میر حسن اردو کی سب سے اہم مثنوی سحر البیان کے مصنف ہیں۔ میر خلیق کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ انیسؔ کے والد تھے۔ انیسؔ ۱۲۱۶ھ اور ۱۲۲۰ھ کے درمیان فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو گھر میں مرثیہ گوئی کا چرچا دیکھا۔ انیسؔ کی طرح ان کے بھائی میر مہر علی آتشؔ اور نواب مونس نے بھی مرثیہ گوئی کی۔ لیکن ان دونوں کو قبول عام نہ مل سکا۔ میر انیسؔ نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن بہت جلد غزل چھوڑ کر مرثیہ کہنے لگے۔ باوجود کوشش کے اب ان کی غزلیں نہیں ملتیں۔ انیسؔ کی سب سے بڑی خوبی ان کی قادرالکلامی ہے۔ نازک خیالات، لطیف جذبات اور مشکل فلسفوں کو سیدھے سادے الفاظ میں برجستگی اور اس بے تکلفی سے بیان کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اور پھر وہ سننے والے کے دل و دماغ پر جو اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں اس میں کامیاب رہتے ہیں۔ واقعہ نگاری پر انیسؔ کو پوری قدرت ہے۔ وہ کسی واقعہ کے صرف ان جزئیات کا بیان کرتے ہیں جس سے پورا واقعہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔ ایک مصور اپنی تصویر میں کہیں ہلکے رنگ استعمال کرتا ہے اور کہیں شوخ۔ وہ جانتا ہے کہ تصویر کے کن کن اجزا کو نمایاں کرنے سے دیکھنے والے کے دل پر وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس کے ذہن میں ہے۔ شاعر یہی کام الفاظ اور انتخاب جزئیات سے لیتا ہے۔ بعض جزئیات کو وہ بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، بعض کو اجمالی طور پر بیان کرتا ہے اور بعض جزئیات کے بیان میں پورا زورِ کلام صرف کر دیتا ہے۔ میر انیسؔ اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے واقعہ نگاری اور منظر نگاری میں اس فن سے کام لیا ہے۔ اردو شاعری پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں حُسن و عشق کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

Scanned with CamScanner

فطرت کے حسن اور اس کی رنگینیوں کو ہمیشہ اردو شاعری نے نظر انداز کیا ہے لیکن یہ بات صرف وہ لوگ کہتے ہیں جو انیس کے مرثیے نہیں پڑھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انیس نے بعض مناظر کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں کہ وہ اصل سے زیادہ خوبصورت اور دل آویز ہوگئی ہیں کیوں کہ اصل منظر میں انھیں جو کمی نظر آئی، انھوں نے اپنی قوتِ تخیل سے پوری کر دی ہے صبح، شام، گرمی اور بہار وغیرہ کا اس طرح بیان کیا ہے کہ مرثیے کے وہ حصے منظر نگاری کے بہترین شاہکار بن گئے ہیں۔ اردو شاعری میں کردار نگاری کی ابتدا انیس کے دادا میر حسن نے اپنی مثنوی سحر البیان میں کی تھی لیکن وہ کردار نگاری کے کامیاب نمونے پیش نہیں کر سکے۔ اُن کا سہرا میر انیس کے سر بندھا۔ کربلا کے واقعات میں بعض لوگ بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میر انیس نے کردار نگاری میں اپنی تمام تر توجہ ان لوگوں پر مرکوز کر دی۔ انھوں نے ظالم اور مظلوم دونوں کی سیرتوں کی مکمل تصویریں پیش کی ہیں۔ خاص طور پر حضرت امام حسین کی شخصیت اور کردار کو اس طرح پیش کیا ہے کہ کردار نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ بن گئے ہیں۔

زبان اور بیان کے معاملہ میں تو میر انیس کا مقابلہ کوئی اور مرثیہ گو نہیں کر سکتا ان کے کلام میں جو سلاست، روانی، فصاحت، بلاغت، شگفتگی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ دبستانِ لکھنؤ میں رعایت لفظی کا استعمال کیا گیا ہے بلکہ بہت اعتدال اور توازن کے ساتھ ان کے کلام میں یہ صفت کہیں عیب نہیں بنی بلکہ اس سے بیان میں اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ انیس سے پہلے پنڈت دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی گلزارِ نسیم میں اس فن کو کمال پر پہنچا دیا تھا۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے روحِ انیس میں لکھا ہے کہ انیس صاحب

دو شخصوں کی گفتگو لکھتے ہیں تو الفاظ طرزِ کلام اور لب و لہجہ میں متکلم اور مخاطب دونوں کی عمر، صنف، سیرت، حیثیت وقتی، قلبی کیفیت، گفتگو کے موقع اور ان کے باہمی تعلقات کا لحاظ رکھتے ہیں۔

اب ہم مراثی انیسؔ سے چند مثالیں دیتے ہیں۔ حُرؓ پہلے یزید کی طرف تھا لیکن آخر میں حضرت امام حسین کے ساتھ شریک ہوگیا۔ یہ سب سے پہلا بہادر تھا جس نے لشکرِ یزید پر حملہ کیا اور شہید ہوا۔ انیسؔ اس کی بہادری کے کارنامے اس طرح بیان کرتے ہیں۔ حُرؓ تلوار لے کر دشمنوں کی فوج پر ٹوٹ پڑا ہے ؎

رعد تھرا گیا نعرے جو سنے غنیم کے — استخواں کانپ گئے زیرِ زمیں رستم کے
تہ و بالا ہوئیں دشمن کی صفیں جم جم کے — برقِ شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبتِ جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیرقیں گر گئیں ہاتھوں سے نشاں چھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا — غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا
شیر سا فوج مخالف پہ جھپٹ کر آیا — رد و بند ڈالا اُسے دم میں جسے سرکش پایا
اس کا قاتل تھا جو دشمن شہِ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیرِ ہلالی کا تھا

حضرت زینب کے دو کم سن بچے عونؓ و محمدؓ دشمنوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت امام حسینؓ ان کی لاش اٹھا کر لاتے ہیں۔ حضرت زینب ان کی لاشوں کے پاس آتی ہیں۔ یہاں انیسؔ نے واقعہ نگاری اور جذبات نگاری کا کمال دکھایا ہے ؎

Scanned with CamScanner

لاشوں پہ لائیں بیویاں زینب کو تھام کر
ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر
بولیں بڑھا کے دستِ مبارک اِدھر اُدھر
بچے کدھر ہیں مجھ کو کچھ آتا نہیں نظر
کیسی دھڑا دھڑ ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں

ماں صدقہ جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو
اس بے کسی میں اماں کی جانب نظر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو
آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو
دیکھو نہ آنچ آئے کوئی خوشخصال پر
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرا کے لال پر

کیسی نیند آئی ہے پیارو اٹھو اٹھو
ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اٹھو اٹھو
ان پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو

گرمی کی شدت کا بیان ملاحظہ ہو

مخفی تھے شرر شدتِ گرما سے حجر میں
چلتی تھی یہ لو آگ بھڑکتی تھی جگر میں
نے بحر میں راحت تھی کسی دل کو نہ بر میں
جھیلوں میں نہ پانی تھا نہ پتے تھے شجر میں
پایاب تھے گرمی سے وہ دریا جو بڑے تھے
سوتیں بھی نہ آتی تھیں کنویں خشک پڑے تھے

تھا مہر کی شدت سے یہ حالِ شہِ ابرار
ماتھے سے ٹپکتا تھا عرق سرخ تھے رخسار
عقیدت میں جنباں تھے لب و لعل و گہربار
بھر کر نفسِ سرد یہ فرماتے تھے ہر بار
اک پھول بھی زہرا کے چمن میں نہ ملے گا
کیا ہوگا جو پانی کسی بن میں نہ ملے گا

Scanned with CamScanner

ان اشعار میں روزمرہ اور محاورہ کا استعمال دیکھئے ؎

حشر تک خلق میں یہ ذکرِ غم انگیز رہا
تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا

تعریف کریں ڈر کے تو خورسند نہ ہونا
اعدا سے کسی بات میں تم بند نہ ہونا

زینب نے کہا جس میں رضائے شہِ عالی
مالک ہیں وہی میں تو ہوں اک چاہنے والی

صدقے گئے فرزند پھوپھی سوگ نشیں ہے
سمجھیں تو مراحق ہے نہ سمجھیں تو نہیں ہے

اردو کے دوسرے عظیم مرثیہ گو مرزا دبیر ہیں جو میر انیس کے ہم عصر تھے۔ دبیر کا پورا نام مرزا سلامت علی تھا اور والد کا نام غلام حسین تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے تھے لیکن بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آگئے اور ساری زندگی یہیں گزری۔

مرزا دبیر کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات اور استعارات برجستہ استعمال ہے۔ وہ اکثر نادر تشبیہات اور نئے نئے استعارے پیدا کرتے ہیں کبھی کبھی اس لگن میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ شعر کے معنی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ شبلی نے ان کے مرثیوں پر تذکرہ کرتے ہوئے "موازنہ انیس و دبیر" میں لکھا ہے کہ خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع، تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے، کہیں تعقید اور اغلاق ہو جاتا ہے تشبیہات پھبتیاں بن جاتی ہیں۔ کہیں محض فرضی خیال رہ جاتی ہیں۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا کلام جہاں فصاحت و بلاغت کے معیار پر بھی پورا اتر جاتا ہے نہایت بلند رتبہ ہو جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اِن اشعار میں جدّتِ بیان ملاحظہ کیجیے ؎

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب　　خورشید کے نشان نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب　　تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے
شب نے زرہ ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخِ پر شتاب　　پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ بہ فنائے آفتاب　　باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب
محتاج مہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

مختصر یہ کہ مرثیہ گوئی کے فن میں میر انیسؔ نے جو کمال حاصل کیا تھا، مرزا دبیر اس سے محروم رہے۔ ان دونوں کے فنِ مرثیہ گوئی کا بہت تفصیلی جائزہ علامہ شبلی نے "موازنۂ انیسؔ و دبیر" میں لیا ہے۔

انیسؔ اور دبیر کے بعد بھی مرثیہ لکھے گئے لیکن کوئی مرثیہ گو اس فن کو ان دونوں سے آگے نہیں لے جا سکا۔ انیسؔ کے تین صاحبزادے تھے۔ سلیس، رئیس، نفیس۔ ان تینوں نے مرثیے کہے لیکن باپ کی سی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

آخر میں ان مرثیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق واقعاتِ کربلا سے نہیں ہے بلکہ کسی کی موت پر لکھے گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ کے دو مرثیے بہت مشہور ہیں جو غزل کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ انھوں نے زین العابدین خاں عارفؔ کی وفات پر لکھا اور دوسرا اپنی کسی محبوبہ کی وفات پر۔ دونوں میں اثر

اور درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مومن کا بھی ایک مرثیہ بہت مشہور ہے۔ یہ مرثیہ محبوب کی وفات پر ترکیب بند کی شکل میں لکھا گیا تھا۔ حالی نے غالب کی وفات پر اور اقبال نے داغ کے مرنے پر مرثیے لکھے تھے جن کا شمار اردو کے بہترین مرثیوں میں ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner